ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

ڈاکٹر جمیل جالبی "تاریخ ادب اردو" (جلد اوّل)
آغاز تا 1750ء تک: جائزہ

Dr. Jameel Jalbi "History of Urdu Literature" (Volume 1) Overview from the Beginning to 1750: A Review

AMNA SAEED

ABSTRACT

*Dr. Jamil Jalbi is a multifaceted figure in Urdu literature celebrated for his roles as a researcher, critic, translator, dictionary editor, and historian. His expertise extends across these diverse capacities, earning him acclaim in each. His profound understanding of culture and civilization further enhances his standing in the literary community. Dr. Jalbi is revered as a highly skilled professional in research and editing, having established fundamental principles for scholarly pursuits in these domains. One of his notable works is the massive "Qadam Rao Padam Rao" in Urdu literature, which is a remarkable example of his proficiency in research and editing. This article aims to spotlight Dr. Jameel Jalbi's contributions as a researcher and editor, emphasizing his unique and dignified approach. Specifically, his work on the masnavi mentioned above is hailed as an undeniable testament to his scholarly dignity. Dr. Jalbi's significant publication, "**History of Urdu Literature,**" spans four volumes. This article focuses on Volume 1, which provides an overview of Urdu literature from its inception to the year 1750. The researcher concludes that Dr. Jameel Jalbi has executed a distinctive and honorable task in editing and researching this historical work, particularly showcasing his skillful reflection on the masnavi. This, in turn, stands as irrefutable evidence of his scholarly stature and contributions to Urdu literature.*

Keywords:
Jameel Jalbi, Urdu Literature, Researcher and Editor, Literary Analysis, History of Urdu Literature-Volume 1

[1] ***M.Phil Urdu (Scholar), Department of Urdu Zuban O Adab, Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi. amna.saed.malik@gmail.com***

تعارف:

ڈاکٹر جمیل جالبی یکم جولائی ۱۹۲۹ء کو علی گڑھ میں یوسف زئی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ذات کے اعتبار سے (یوسف زئی) یہ خاندان معزز ترین خاندانوں میں شمار ہوتا ہے۔ جمیل جالبی کا اصل نام جو انہیں پیدائش کے وقت ملا وہ محمد جمیل خان تھا۔ دادا سے محبت اس قدر تھی کہ اپنے نام کے ساتھ دادا کا نام جوڑ لیا اور یوں جمیل خان سے جمیل جالبی کہلائے۔ آپ کے والد محترم بنام محمد ابراہیم خان اور والدہ اکبری بیگم اٹھارویں صدی میں سوات سے ہجرت کر کے ہندوستان کی سرزمین پر سکونت اختیار کرنے کی غرض سے تشریف لائے۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی جائے پیدائش ہندوستان کے شہر سہارن پور ملتی ہے۔ جمیل جالبی صاحب نے اپنی ابتدائی عمر کے لمحات ہندوستان میں گزارے اور باقی زندگی کا سفر پاکستان میں بسر کیا۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم علی گڑھ سے حاصل کی۔ سن 1943ء میں میٹرک کی سند گورنمنٹ ہائی اسکول سہارن پور سے حاصل کی۔ بعد ازاں 1945ء میں انٹر میڈیٹ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

اور 1947ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ نے اُردو میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وکالت کی سند حاصل کی۔ 1972ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری اپنے عزیز استاد جناب ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان کی زیر نگرانی سندھ یونی ورسٹی سے بعُنوان "قدیم اُردو ادب" پر مقالہ تحریر کر کے حاصل کی۔ آپ کا علمی رجحان کی بدولت سن 1978ء میں آپ کو مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" پر ڈی لٹ کی اسناد سے بھی نوازا گیا۔ آپ کو تعلیم سے اس قدر رغبت تھی کہ اس شوق کی وجہ سے یکے بعد دیگرے آپ نے کئی اسناد حاصل کیں۔ اسی شوق کی بنا پر اور خاص کر اپنی ذہنی صلاحیتوں کو آزمانے کی خاطر آپ نے سی ایس ایس کا امتحان دینے کا فیصلہ کیا اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

سی ایس ایس میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد آپ محکمہ انکم ٹیکس سے طویل عرصے تک وابستہ رہے۔ علاوہ ازیں کراچی یونیورسٹی میں وائس چانسلر اور مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین حیثیت سے بھی اپنے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ مزید براں اپنی قابلیت کی بنا پر علمی و ادبی کانفرنسوں اور سیمینار میں شرکت کے لیے مختلف بیرونِ ممالک بھی مدعو کیے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی بہت سی اعلیٰ خصوصیات میں سے ایک خاص خوبی تیہ رہی کہ آپ نے ہمیشہ اس بات کو فکرِ محور بنایا۔ جس کی فکر اس دورِ معاشرت کو خاص طور پر رہی۔ حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ نے اپنی سوچوں کا محور علمی وادبی منصوبوں کے گرد مائل رکھا اور اپنی قابلیت اور ذہنی اوصاف کی بدولت انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی حد خاطر توجہ صرف کی۔

ادبی خدمات:

ڈاکٹر جمیل جالبی کے علمی، ادبی اور تحقیقی کارناموں سے کون واقف نہیں۔ آپ کا شمار پاکستان کے نامور اُردو ادب کے نقاد، ماہرِ لسانیات اور ادبی مؤرخین میں کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ 1983ء کراچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر، 1987ء چیئرمین مقتدرہ قومی زبان جس کا اب موجودہ نام ادارہ فروغ قومی زبان ہے میں بھی اپنے فرائض سر انجام دیئے۔ بعد ازاں 1990ء تا 1997ء تک آپ صدر اُردو لغت بورڈ بھی رہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے اہم کاموں میں قومی انگریزی اُردو لغت کی تدوین، تاریخ ادب اُردو (چار جلدیں)، ارسطو سے ایلیٹ تک، پاکستانی کلچر جس میں قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ پیش ہے جیسی اہم کتب کی تصنیف و تالیف شامل ہے۔ دیکھا جائے تو اُردو زبان و ادب پر بہت سے مورخین نے اردو کے آغاز سے متعلق تاریخیں تحریر کی ہیں۔ لیکن مستقل مزاجی، علمی و تحقیقی لحاظ سے جو مقام ڈاکٹر جمیل جالبی کی چار جلدوں پر مبنی "تاریخ ادب اُردو" کو حاصل ہوا وہ اُردو زبان و ادب کی کسی اور تاریخ کو حاصل نہیں۔

بقول ڈاکٹر گیان چند جین:

> "کوئی شبہہ نہیں کہ یہ "تاریخ ادبِ اردو" اب تک کی بہترین کتاب ہے۔ کوئی توقع نہیں کہ عرصے تک اس سے بہتر، بلکہ اس کی ہم پلہ تاریخ لکھی جاسکے گی۔"2

اسی طرح "ارسطو سے ایلیٹ تک" میں مغرب کی دو ہزار سالہ فکری تنقید کو جس انداز سے ترجمہ و تعارف کے ساتھ اُردو قارئین کے لیے پیش کیا اُردو ادب میں وہ خود اپنے آپ میں ایک جامع اور وقیع علمی کارنامہ ہے۔ جمیل جالبی کی کتاب "پاکستانی کلچر: قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ" میں وسعت نظر سے کام لیتے ہوئے خاص اندازِ فکر ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے اپنی سرکاری ملازمت کے دوران "نیا دور" کے نام سے اعلیٰ ادبی معیار کا رسالہ بھی جاری کیا۔ بطور سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے رسالے پر ان کا اپنا نام شائع نہیں ہوا۔ لیکن ادبی حلقہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ اس رسالے "نیا دور" کے ذریعے جدید اُردو ادب و ادبی رجحانات اور مغرب کے نمائندہ ادب کی ہمارے ادب میں جتنی آبیاری ہوئی وہ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی مرہون منت ہے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

تصانیف:

ڈاکٹر جمیل جالبی کا ادب سے شوق اور گہرے لگاؤ کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہوتا ہے کہ آپ نے سولہ کتابیں تالیف کیں۔ جن میں تصنیف و تالیف کے ساتھ ترجمہ کی کتب بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے دو سو سے زائد مضامین قلم بند کیے۔ آپ کی سب سے اولین تخلیق جو منظرِ عام پر آئی وہ "سکندر اور ڈاکو" کے نام سے ہے۔ یہ کہانی تقریباً بارہ سال کی عمر میں آپ نے تحریر کی۔ اس کہانی کو اساتذہ نے نہ صرف پسند کیا بلکہ اسے بطور ڈراما اسکول اسٹیج پر پیش بھی کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی تحریریں "بنات" اور "عصمت" دہلی کے رسائل میں بھی چھپتی رہیں ہیں۔ آپ کی سب سے پہلی ترجمہ شدہ کتاب "جانورستان" ہے۔ یہ کتاب ایک انگریز مصنف جارج آرول کے ناول کا ترجمہ تھی۔ اس کے بعد آٹھ ایڈیشن پر مشتمل "پاکستان کلچر: قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ" منظر عام پر آئی جو خاص اہمیت کے حامل ٹھہری۔ مزید براں آپ کی چار جلدوں پر مشتمل "تاریخ ادب اُردو" جو اُردو ادب میں بیش قیمت کارنامہ قرار دیا جاتا ہے کی اشاعت شامل ہے۔ دیگر تصانیف و تالیفات میں "تنقید و تجربہ"، "نئی تنقید"، "ادب کلچر اور مسائل"، "محمد تقی میر"، "میر اجی: ایک مطالعہ"، "معاصر ادب (ادبی تنقید و فکری مضامین)"، "بارہ کہانیاں (بچوں کا ادب)"، حیرت ناک کہانیاں (بچوں کا ادب)"، خوجی (بچوں کا ادب)"، "قومی زبان یک جہتی نفاذ اور مسائل (فکری مضامین)"، "قلندر بخش جرأت لکھنوی تہذیب کا نمائندہ شاعر"، "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ"، "دیوانِ حسن شوقی" اور "دیوانِ نصرتی"، "برصغیر میں اسلامی جدیدیت" شامل ہیں۔ اس کے علاوہ "قدیم اُردو کی لغت"، "فرہنگ اصلاحات جامعہ عثمانیہ" اور "قومی انگریزی اُردو لغت" آپ کی اہم تصنیفات گردانی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے متعدد انگریزی کتابوں کے تراجم بھی کیے جن میں "جانورستان"، "ایلیٹ کے مضامین"، اور "ارسطو سے ایلیٹ" تک شامل ہے۔

اعزازات:

ڈاکٹر جمیل جالبی کو اعلیٰ علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں 1964ء، 1973ء، 1974ء اور 1975ء میں ان کی چار کتابوں کو "داؤد ادبی انعام" سے نوازا ۔ جبکہ 1987ء میں "یونیورسٹی گولڈ میڈل"، 1989ء میں "محمد طفیل ادبی ایوارڈ" پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ حکومتِ پاکستان کی جانب سے 1990ء میں "ستارۂ امتیاز" اور 1994ء میں "ہلال امتیاز" جیسے پاکستان کے بڑے اعزازات سے نوازا۔ مزید براں اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے 2015ء میں ڈاکٹر جمیل جالبی کو پاکستان کے بڑے ادبی انعام "کمال فنِ ادب انعام" سے نوازا گیا۔

حرفِ آخر:

ادب کا جگمگاتا ستارہ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب 89 برس کی عمر میں 18 اپریل 2019ء کو پاکستان کے شہر کراچی میں دنیا فانی سے کوچ کر گے۔ اور یوں ادب کا ایک روشن ستارہ ہم سے بچھڑ گیا۔

کتاب کا تعارف:

"تاریخ ادب اُردو" (جلد اوّل) آغاز سے 1850ء تک ڈاکٹر جمیل جالبی کی اُردو ادب کی تاریخ سے متعلق پہلی جلد ہے۔ یہ کتاب اُردو کی تاریخ کا ابتداء سے لیکر 1750ء تک قدیم اُردو ادب کا احاطہ کرتی ہے۔ جس طرح ہم دورِ جدید کے ادب کو تاریخی، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور لسانی نقطہ نظر سے پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ادب سے شناسائی حاصل کرنے کی خاطر ہمیں دورِ قدیم کے ادب کا سیاسی، سماجی، اقتصادی و لسانی حیثیت کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ تاکہ ہم ادب کو اس کے صحیح پس منظر میں سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت کو جان سکیں۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

ڈاکٹر جمیل جالبی سے پہلے اس موضوع پر مصنفین نے جتنی بھی ادبی تاریخیں لکھی۔ ان میں ہر ایک نے کسی نہ کسی اکائی کو سامنے رکھ کر کام کیا۔ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان سابقہ تمام مسودہ جات کو ایک ہی نظر سے دیکھا اور تاریخ ادب اُردو کی صورت میں پیش کیا۔ ان کی تاریخ سازی کے پیشِ نظر یہ واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک دہلی اور دکنی ادب میں کوئی خاص فرق نہیں، بلکہ جالبی صاحب کے بیانیے کے مطابق ہر جگہ کا ادب وہاں کے حالات کے پیشِ نظر تخلیق ہوتا چلا گیا۔ ادب کی تاریخ سازی میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی عمیق مطالعہ، گہرا مشاہدہ اور نیا طرز تحریر ادب کے میدان میں بہت کارگر ثابت ہوا ۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی انفرادیت اور تخلیقی و تحقیقی صلاحیت کی بدولت اپنی بقیہ جلدیں اعلیٰ سطح پر مکمل کی جو نہ صرف اُردو ادب کے طالب علم بلکہ اُردو تاریخ دانوں کے لیے بھی ایک اہم ماخذ اور قیمتی سرمایہ ہے۔

"تاریخ ادب اُردو" جلد اوّل کا خاکہ اس طرز پر بنایا گیا ہے کہ ادب کی ساری تصنیف کو ترتیبِ زمانی سے چھے فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جلد اوّل کی ہر فصل کے تحت مختلف ابواب شامل ہیں۔

ہر فصل کا پہلا باب اس میں موجود دور کی تمہیدی حیثیت کے حامل ہے۔ اس دور کے ہر پیرائے کو جالبی صاحب نے اس انداز میں قلم بند کیا ہے کہ اس دور کا ادب تمہیدی پیرائے میں واضح ہوتے ہوئے اس دور کی مکمل تصویر قارئین کے سامنے آجائے۔ کتاب میں شامل تمہیدی باب کی روشنی میں ترتیبِ زمانی سے سابقہ دور کے ممتاز و نمائندہ شاعروں اور ادیبوں کے ذہن واثرات اور ان کے تخلیقی کاوشوں کا تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ چونکہ ہر دور کی نظم و نثر ایک ہی طرز احساس کا اظہار کرتی ہے۔ اس لیے دوسری تاریخوں کے برخلاف ان کا مطالعہ بھی ایک ساتھ ہی کیا گیا۔ کتاب میں شامل ہر شاعر و ادیب کو اس کی ادبی اور تاریخی حیثیت کے مطابق برتا گیا ہے۔ جیسا کہ قدیم دور کا بیشتر سرمایہ مخطوطات پر مشتمل تھا، لہٰذا اس دور کے ادب کا مطالعہ اور اس پر تحقیق دشوار کُن مرحلہ ثابت ہوتا ہے۔ کتاب کو مستند بنانے کی خاطر اس دور کے حوالے حواشی میں دیئے گئے ہیں اور یہی قدیم عمل مطبوعہ کتب میں بھی پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے اختتام میں اختصار کے ساتھ روایات کے اتار چڑھاؤ کی داستان کو بیان کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اُردو زبان و ادب کے عالم گیر رواج کی منطقی وجوہ پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ آخر میں ضمیمے کے تحت "پاکستان میں اُردو" کو موضوع بنا کر پاکستان کے چاروں صوبوں میں اُردو روایت کے تعلق اور قدیم روایت کا سراغ لگایا گیا ہے۔

تمہید:

اُردو زبان جسے ابتدا میں "ہندی"، "ہندوی" بھی کہا جاتا رہا۔ یہ زبان لشکری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُردو زبان وہ زبان ہے جو ادبی دنیا کی کئی دوسری زبانوں کی طرح صدیوں سر جھاڑ گلی کوچوں میں آوارہ اور بازاربات میں پریشان حال ماری ماری پھرتی رہی۔ چونکہ اس دور میں فارسی زبان کو ایک خاص اہمیت حاصل رہی۔ تاہم، اس زبان اردو کو کبھی اقتدار کی قوت نے دبایا تو کبھی اہل نظر نے حقیر جان کر اسے منہ نہ لگایا اور تو اور کبھی تہذیبی دھاروں نے اسے مغلوب کر دیا۔ مسلمان فاتحین جب برعظیم پاک وہند میں داخل ہوئے تو وہ اپنے ساتھ عربی، فارسی اور ترکی لائے۔ جب ان مسلمان فاتحین کا برصغیر پر تسلط قائم ہوا جیسا کہ فارسی زبان کو اعلیٰ مقام حاصل تھا، لہٰذا اس دور میں فارسی نے سرکاری زبان کی حیثیت حاصل کر لی۔ تاریخ شاہد ہے کہ حاکم قومیں اپنے ساتھ اپنی زبان، اصول و قوائد اور روایات ساتھ لاتی ہیں۔ چنانچہ اس سرزمین میں پہلے سے موجود محکوم اقوام جن کی تہذیبی و تخلیقی قوت پست ہو چکی ہوتی ہیں وہ فارتحین کی زبان اور تہذیب سے اپنی زندگی میں نئے معنی، شعور اور احساسات کو جنم دیتی ہیں۔ مسلم فاتحین کا کلچر ایک فاتح قوم کا کلچر تھا۔ ان کی تہذیب وروایات نے ہندوستان کی ثقافت کو نئے انداز سکھائے اور وہاں کی بولیوں پر اثر انداز ہوئے۔ ان بولیوں میں سے ایک بولی جو پہلے اپنے اندر جذب وقبول کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی تھی۔ اس بولی نے بڑھ کر نئی لفظیات کو اپنایا اور تیزی سے ایک مشترک بولی بن کر نمایاں ہونے لگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ زبان تو ترقی کرتی رہی لیکن فارسی زبان نے اسے بہت کچھ دینے کے باوجود اپنے ہم پلہ کبھی جگہ نہ دی۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

مسلمانوں کے اقتدار و حکمرانی کے زمانے میں ان کے انداز و روایت اور زبانوں کا گہرا اثر پڑا۔ جس کے نتیجہ میں فارسی، ترکی اور عربی لفظیات اس زبان میں داخل ہو کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں جذب ہو گئی۔ اس طرح برصغیر کی گری پڑی زبان میں اظہار کی قوت تیز ہوئی۔ نئے الفاظ اور خیالات نے انہیں احساس و شعور کا نیا سلیقہ دیا۔ جس کی بدولت ادبی تخلیق کا بازار گرم ہوا۔ اُردو شعراء حضرات کے سامنے فارسی ادب و اصناف کے نمونے موجود تھے۔ انھوں نے ان نمونوں کو معیار بنا کر دل و جان سے نہ صرف قبول کیا بلکہ اپنے کلام میں اس زبان فارسی کو خاص مقام پر جگہ دی۔

مسلمان فاتحین اپنے ساتھ ان بولیوں کو لے جاتے اور جہاں پڑاؤ ڈالتے وہاں کے مقامی لوگوں کے ساتھ گُفت و شُنید ہونے کے سبب یہ زبان وہاں کے علاقائی اثرات کو جذب کر کے اپنا نیا روپ اختیار کرتی چلی جاتی۔ اس زبان کا ایک رُوپ سندھ اور ملتان میں تیار ہوا۔ پھر یہ لسانی عمل سندھ و ملتان سے سرحد و پنجاب میں جا پہنچا۔ جہاں سے تقریباً دو صدی بعد اس زبان کی دہلی میں آمد ہوئی اور وہاں کی مقامی بولیوں کو جذب کرتے ہوئے ان میں جذب ہو کر پورے برعظیم میں پھیل گی۔ گجرات میں یہ زبان "گجری" کہلائی۔ دکن میں اس زبان کو "دکنی" پکارا گیا۔ کسی نے اسے "ہندی" اور "ہندوی" کہا۔ تو کسی نے "لاہوری" اور "دہلوی" زبان کے نام سے موسوم کیا۔ اسی حساب سے کسی نے اس کا رشتہ ناتا "برج بھاشا" سے جوڑا تو کسی نے اسے "کھڑی بولی" سے ملایا۔ اسی طرح کسی نے اس زبان کو پنجاب سے اخذ شدّہ زبان کہا تو کسی نے سندھی، سرائیکی اور مختلف زبانوں سے اس کا تعلق جوڑا۔ پس مختلف علاقوں کا اس زبان پر دعویٰ اس بات کی دلیل ہے کہ اس زبان "اُردو" نے سب زبانوں سے فیض پایا۔

اُردو جدید ہند آریائی خاندان سے نہ صرف تعلق رکھتی ہے۔ بلکہ یہ زبان عربی، ایرانی اور ہندی تینوں تہذیبوں کا سنگم اور ان کی منفرد علامت ہے۔ اس زبان میں ان تہذبوں کی ہمہ گیر صفات یکجا ہو کر ایک جان ہوئی۔ یہ زبان برعظم کی معاشرتی، تہذیبی و سیاسی ضروریات کے تحت پروان چڑھی۔ مسلمانوں نے ضرورت کے تحت اسے اپنایا اور انہی کے سبب یہ زبان برعظم کے گوشے گوشے میں اس طرح پھیل گئی کہ کوہ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک سمجھی اور بولی جانے لگی۔

یہاں ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے اس بات کی صراحت ضرور کی ہے کہ (برعظیم کی جدید آریائی زبانیں سنسکرت سے نہیں نکلی۔ بلکہ سنسکرت خود قدیم زمانے کی کسی بولی کی ایک منجھی ہوئی معیاری شکل ہے)۔ جو ۳۰۰ق م کے زمانے میں عام بول چال کی زبان نہیں تھی لیکن سیاسی اور علم و ادب کی زبان ہونے کی وجہ سے مادری زبان کے ساتھ ساتھ ایک دوسری زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ جمیل جالبی کے مطابق "رک وید" کی زبان کو عہد عتیق کی زبان کہا جاسکتا ہے۔ اس کی شستہ و رفتہ اور قوائد سازوں کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق معیاری شکل کا نام "سنسکرت" ہے۔

سنسکرت ایک ہند زبان تھی۔ لیکن اس کے برعکس "آپ بھرنش" کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے ضرورت کے مطابق نہ صرف پراکرت و سنسکرت کے الفاظ کو اپنایا، بلکہ دل کھول کر دوسری دیسی زبانوں کی لغات کو اپنے دامن میں جگہ دی۔ سیاسی انتشار کے سبب جب برعظیم کے مختلف علاقے مسلمان راجاؤں کے زیر نگیں آئے۔ اس سیاسی انتشار اور حاکمیت کے عمل کے تحت صدیاں گزر گئیں۔ جس کی وجہ سے اس خطے میں "آپ بھرنش" کے بجائے ہر علاقے کی اپنی بولی وجود میں آئی۔ جس کا تذکرہ دورت نے "ملک کے حساب سے آپ بھرنش کی کئی قسمیں ہیں" کہہ کر کیا ہے۔ یہ لسانی امتزاج کا ایک نیا اور فطری عمل تھا۔ اس کی صورت بالکل ویسی تھی جسے قدیم زمانے میں زبان اُردو کی تھی۔ جیسا کہ یہ زبان گجرات میں "گجری" کہلائی تو دکن میں اسے "دکنی" کا نام دیا گیا۔ کہیں "لاہوری" اور "دہلوی" کے نام سے موسوم ہوئی تو کہیں "ہندوی" اور "کھڑی بولی" کہا گیا۔ پھر صدیوں بعد ولی کے دور میں "ریختہ" اور بعد ازاں "اُردو" کے نام سے ایک عالمگیر معیار تک پہنچی۔

اس دور میں "پنجابی"، "سرائیکی"، "گجراتی"، "راجستھانی"، "کھڑی"، "برج بھاشا" وغیرہ کے ملے جلے اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ شور سینی، آپ بھرنش کا رُوپ ہے۔ اُردو زبان اسی بین الاقوامی ملک گیر شور سینی آپ بھرنش کا جدید رُوپ ہے۔ محمد بن قاسم نے 712ء میں سندھ اور ملتان فتح کیا۔ تو یہاں ایک ایسی زبان بولی جاتی تھی جو سیاحی اثرات رکھتی تھی۔ سندھ کو جس اسلامی لشکر نے فتح کیا اس میں "فارسی" اور "عربی" بولنے والے شامل تھے۔ وہ عمل جو

عربوں کی فتح نے خود سر زمینِ ایران پر کیا تھا، وہی عمل سر زمینِ سندھ و ملتان پر بھی ہوا۔ فتح سندھ و ملتان کے بعد مسلمانوں کی یہ پیش قدمی، انہی علاقوں تک محدود رہی اور تقریباً تین سو سال تک ان کی زبانیں، تہذیب و معاشرت یہاں کی تہذیب و معاشرت اور زبان کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی متاثر ہوتی رہی۔ سلطان محمود غزنوی کے حملے (۱۰۰۱ع) سے بہت پہلے ہی مسلمان مغربی ہندوستان میں ایک اہم حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ ان کی تہذیب، سکہ رائج الوقت کی حیثیت رکھتی تھی۔ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کی فتح کے وقت ہندوستان کی بالکل ایسی حالت تھی جیسے مقدونیا کے بر سر اقتدار آنے سے پہلے یونان کی حالت تھی۔ دونوں ملکوں میں ایک سیاسی وحدت بنانے کی اہلیت کا فقدان تھا۔"4

مسلم فاتح محمود غزنوی (۳۸۸ھ-421ھ) نے شمال مغرب سے ہندوستان پر حملے کیے اور مختصر عرصے میں سندھ، ملتان اور پنجاب سے لے کر میرٹھ اور دہلی کے نواحی علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ یوں تقریباً دو سو سال تک ان علاقوں پر محمود غزنوی حکومت کرتے رہے۔ وقتِ سیاہ کے سبب غوریوں نے غزنی پر قابض ہو کر محمود کے جانشینوں کو نکال باہر کیا تو آلِ محمود غزنوی نے پنجاب کو اپنا مستقر اور لاہور کو دارالحکومت بنا لیا۔ یہ جوگی مورتیوں کی پوجا کے مخالف اور وحدانیت کے قائل ہونے کے سبب معرفت نفس کو سب سے بڑا درجہ دیتے تھے۔ ان کے خیالات و افکار صوفیاء کرام سے بے حد قریب تھے۔ ناتھ پنتھیوں کی تصانیف میں جو زبان استعمال ہوئی اسکا نمونہ درج ہے۔

سو اسی تم ہی کرو کو سائیں	اسی جو شش سبد ایک بوجھیا
ترانکھے چیلا کو نٹر بدھ رہے	ست گر دھوئی ساپچھیا کہے

اس نمونہ میں ہمیں خالص ہندوی لہجے کا احساس ہوتا ہے۔ جب اس پر "عربی و ایرانی" تہذیب اور زبانوں نے اپنا سایہ ڈالا تو نئے لہجے، تلفظ اور نئی آواز میں پیدا ہوئی۔ رفتہ رفتہ نئے لفظوں کی آمد نے اس زبان کا رنگ و روپ بدل ڈالا۔

مسلمان فاتحین اس سر زمینِ ہند میں واپس لوٹ جانے کے ارادے سے نہیں آئے۔ بلکہ آریوں کی طرح اس ملک کو اپنا مستقل ٹھکانا بنا کر رہنے لگے۔ دوسری وجہ یہ ٹھہری کہ یہاں کے پہلے سے موجود رہنے والوں کی تہذیب کمزور اور زوال پذیر تھی۔ اس کے برعکس باہر سے آنے والے فاتحین کے پاس جاندار زبانیں ہونے کے ساتھ ان کے خیالات و عقائد میں توانائی تھی۔ امورِ سلطنت اور بالغرض کاروباری معاملات اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کی وجہ سے زبانوں میں ایک دوسرے کے الفاظ شامل ہوئے۔ تاہم جب قومی کلچر کمزور کلچر سے ملا تو وہاں کی تہذیب کی طرح ان کی بولیوں میں بھی نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔

محمد بن قاسم کا دور محمود غزنوی کے دور تک تقریباً تین سو سال پر محیط ہے۔ محمود غزنوی سے بابر کی فتح تک کا زمانہ تقریباً پانچ سو سال پر محیط ہے۔ اس عرصے تک اتنی تبدیلیاں رونما ہوئی کہ اس طویل عرصے میں زندگی اپنے پورے پھیلاؤ اور وسعتوں کے ساتھ نئے روپ میں ڈھل چکی تھی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق شمالی ہند سے آنے والے حکمران خاندان جب گجرات سے دکن تک کے علاقوں میں اپنے متوسلین کے ساتھ آباد ہوئے ہوں گے تو تہذیبی و لسانی سطح پر تبدیلیاں ضرور در پیش ہوئی ہوں گی۔ یہ لوگ ترک نژاد تھے۔ لیکن خود ان کو شمالی ہند میں شمال مغرب سے لے کر دہلی تک آباد ہوئے صدیاں بیت چکی تھیں۔ یہ لوگ شمالی ہند سے اپنے ساتھ وہ زبان لے کر آئے جو بازاروں میں بولی جاتی تھی۔ ان لوگ نے اسی زبان کے ذریعے معاملاتِ زندگی طے کیے۔ امیرانِ صدر کے اپنے حلقوں کی زبان مختلف ہونے کی وجہ سے یہ نہ ترکی اور نہ ہی فارسی کے ذریعے معاشرتی سطح پر لین دین کر سکتے تھے۔ لہٰذا معاشرتی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حاکموں نے اپنے ساتھ لائی ہوئی زبان کو سیاسی و معاشرتی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی زبان کو

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

نئے ماحول میں قابل قبول بنانے کی غرض سے مقامی بولیوں کا سہارا لیا۔ اسی نظام کو بغیر کسی تبدیلی کے نہ صرف محمد تغلق (1325-1351) نے باقی رکھا بلکہ اسے مضبوط تر بنانے کے لیے احکامات جاری کیے۔ جس کی وجہ سے شمال کے لیے دکن اور گجرات کے راستے کھلے رہے۔ اس نتیجے کے سبب تجارتی لین دین، معاشرتی امور بڑھتا گیا اور ان علاقوں میں زبان اُردو کا حلقہ بھی پھیلتا رہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ زبان بول چال سے گزر کر ادبی سطح پر آئی۔ صوفیوں، شاعروں نے اسے اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ گجرات میں اس کے ادبی روپ کو "گجری" کا نام دیا گیا اور دکن میں یہ زبان "دکنی" کہلائی۔

دکن اور گجرات تک اس زبان کے پھلنے پھولنے اور بڑھے پھیلنے کے لیے ایسی ساز گار فضا پیدا ہوئی کہ یہ زبان سارے علاقوں کی مشترک زبان بن کر تیزی سے ترقی کے زینے طے کرنے لگی۔ صوفیائے کرام نے اس زبان کو تبلیغ دین و اخلاق کے لیے استعمال کیا۔ قوالی، موسیقی، شاعری اور درس اخلاق کی یہی زبان ٹھہری۔ عام معاملات زندگی اور دربار سرکار کے مختلف طبقوں کے درمیان یہی زبان وسیلہ اظہار بنی۔ اُردو زبان کا اب تک یہی مزاج قائم ہے۔ اور بر عظیم پاک و ہند کے مختلف علاقوں میں یہ زبان "اُردو" آج اپنا مقام قائم کیے ہوئے ہے۔

فصل اوّل:

فصل اوّل میں تین ابواب کو شامل کیا گیا ہے۔ پہلا باب مسعود سعد سلمان سے گرونانک تک (۱۰۵۰ع-1525ع) ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ مسعود سعد سلمان (۱۰۵۰ع-1525ع) لاہور سے تعلق رکھنے والے "ہندوی" کے پہلے شاعر تھے۔ مسعود سعد سلمان کے بارے میں "غزۃ الکمال" کے دیباچے میں امیر خسرو نے لکھا ہے کہ پیش ازیں شایان سخن کے راسہ دیواں ہودہ مگر مرا کہ خسرو ممالک کلاے۔ امیر خسرو کی فارسی مثنوی "تغلق نامہ" میں ایک فقرہ ہے۔ جو ہندی زبان کے رنگ ڈھنگ کو ظاہر کرتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسعود سعد سلمان کی زبان ہندوی سے امیر خسرو کون سی زبان مُراد لیتے ہیں۔ مسعود سعد سلمان کا دیوان اگرچہ ناپید ہے۔ اگر ان کا کوئی مسودہ دستیاب ہوتا تو زبانِ ادب کے مسائل کی بہت سی گتھیاں سلجھنے کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کی نشو و نما اور رواج کی گمشدہ کڑیاں ملی بھی جاتیں۔

یہ زبان چونکہ ہندوستان میں ہر طرف بولے جانے والی زبان اور رابطے کی واحد زبان ہے۔ اس لیے اس کے الفاظ اور محاورے فارسی تصانیف میں در آئے ہیں۔ ابو الفرج کے کلام میں دلہ، جوہر، جت (جٹ) کے الفاظ اسی بے تکلفی سے استعمال ہوئے ہیں۔ خواجہ مسعود سعد سلمان نے اپنے فارسی دیوان میں کٹ، مارامارا، اور ہر شکل کے بے تکلف فارسی لفظیات کو استعمال کیا ہے۔ حکیم سنائی (545ھ-115ع) کے ہاں "کوتوال" اور "پانی" کے الفاظ ملتے ہیں۔ منہاج سراج نے طبقات ناصری (658ھ) میں "سیل"، "ٹک" اور "بہار" (بمعنی وہار) سمندر کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ امیر خسرو جن کے مزاج میں یہ زبان رچی بسی ہے۔ اپنے احساسات و خیالات کو اسی زبان کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ فارسی تصانیف میں نہ صرف اس زبان کے الفاظ بلکہ محاورات بھی پائے جاتے رہے۔ اہل قلم جو اس پر عظیم خطے میں پیدا ہوئے وہ لکھتے تو فارسی میں تھے۔ لیکن سوچتے وہ اسی زبان اردو میں تھے۔ ان لوگوں کی فارسی پر بھی جو یہاں ایک عرصہ سے آباد تھے۔ اسی زبان کی ساحت، انداز، گفتار اور محاوروں کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔

اُردو زبان اپنے قدیم دور میں ہی اس حالت میں آگئی تھی۔ کہ اہل قلم اپنے اظہار کے لیے اسی زبان اُردو کا سہارا لیتے تھے۔ تاکہ ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنے والے دانش وران کی تحریروں کو مکمل طور پر سمجھ سکیں۔ امیر خسرو نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ چونکہ اہلِ ایران کی زبان فارسی ہے۔ تاہم، ان کے ادا کیے الفاظ اور محاورے ایران والوں کے لیے اجنبی ہیں۔

کبیر "خ" کو "کھ" سے "ق" کو "ک" سے بدل دیتے ہیں۔ جیسے تخت کے بجائے "تکھت" وغیرہ۔ کبیر کے کلام کو دیکھا جائے تو اس میں عوامی زبان، لہجے، آہنگ اور ترنم کی سادگی پائی جاتی ہے۔ اور یہی آہنگ، ترنم اور عوامی زبان و لہجہ برصغیر کے باسیوں کے دلوں میں اُتر جاتا ہے۔ کبیر اسی زبان کے پیشِ نظر بڑے سے بڑا خیال سیدھے سادے انداز میں بیان کرتے ہیں۔

گرو نانک نے کبیر کو اپنا پیشوا کہا ہے۔ ۱۴۹۶ء میں نانک صاحب کی کبیر سے ملاقات ہوئی۔ شیخ عبد القدوس گنگوہی جن کا سال وفات وہی ہے جو گرو نانک کا ہے۔ شیخ عبد القدوس گنگوہی نے اپنے خط میں گرو نانک کا ایک دوہا لکھا ہے۔ "موبو پیاس نانک لہو پانی "اسی قسم کے اور بھی دوہے ملتے ہیں۔ گرو نانک صاحب کا بیشتر کلام پنجابی میں موجود ہے۔ ان کے کلام میں اُردو زبان کے مروجہ ذخیرہ الفاظ کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ ان کے کلام میں پنجابی زبان کے ساتھ کھڑی بولی کے اسماء افعال اور ضمائر استعمال کیے گئے ہیں۔ اسی طرح (لک، لاکھ)، (اُبسّر، اُوپر) وغیرہ شامل ہیں۔

گرو گرنتھ صاحب میں اُردو زبان کی جو شکل وصورت ملتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات کی تبلیغ کیلئے اسی زبان اُردو کا سہارا لیا ہے۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

1- بابا اللہ اگم اپار

پاکی تائیں پاک تھائیں سچا پرودگار (**پروردگار**)، پیر پیکامبر (**پیغامبر**)، سہید (**شہید**)، سیکھ مسائک (**شیخ مشائخ**)، کاجی (**قاضی**)، درویس (**درویش**)

گرو نانک کے ہاں فارسی اور عربی الفاظ ہندوی سانچے اور تلفظ میں ڈھلتے نظر آتے ہیں۔ کبیر کے ہاں بھی یہی عنصر پایا جاتا ہے۔ ان صوفی حضرات کے ہاں یہ الفاظ اس لیے استعمال میں رہے کیونکہ ان الفاظ کے بغیر اظہار کا سرا ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ یہ الفاظ اسی فکر کے باعث ان کے کلام میں از خود چلے آتے ہیں۔ جیسا کہ گرو نانک نے اصلاحِ معاشرہ اور عرفانِ ذات کے لیے قبول کر لیا ہے۔ "گرو گرنتھ صاحب" میں عربی، فارسی الفاظ کی تقریباً 3۱۳۴ تعداد پائی جاتی ہے۔ جو اُردو زبان کی لغت کا جُز ہیں۔ بحثیت مجموعی الفاظ کی تعداد دیکھیں تو کئی ہزار تک جا پہنچتی ہے۔

دوسرا باب بابر سے شاہجہان تک (۱۵۲۵ع-۱۶۵۷ع) ہے۔ اس باب میں واضح کیا گیا ہے کہ ظہیر الدین بابر (1530ع) کی آمد برعظیم کی سرزمین پر ہوئی۔ ظہیر الدین بابر کی مادری زبان ترکی تھی۔ لیکن یہاں ہندوستان میں بابر کا ایسی زبان سے سابقہ پڑا جو اس کی زبان سے قدرِ مختلف تھی۔ بابر اپنے دورِ سلطنت میں ہندوستان کے سینکڑوں آدمیوں سے ملا۔ دفاعی انتظام، صنعت و تجارت اور سیاسی امور میں اُسے قدم قدم پر مقامی لوگوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ "تُوزک بابری" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں بابر زبانِ اُردو سے اتنا واقف ہو گیا تھا کہ ہندوستان کے مقامی لوگوں کی بات سمجھنے اور ضرورت کے تحت اپنی بات ان تک پہنچانے کے قابل ہو چکا تھا۔ لہٰذا بابر نے اپنی تصنیف "تُوزک بابری" میں متعدد اردو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اگر یہ ہندوی زبان بابر کو اس سارے علاقے میں جو اس نے فتح کیا تھا نہ بولی جاتی اور برعظیم میں کوئی ایک مشترکہ زبان نہ ہوتی تو باہر کے لیے اس زبان کا سیکھنا ناممکن ہوتا۔

پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے بابر کے اڑتیس صفحات پر مشتمل ترکی دیوان جس کے حاشیے پر شاہ جہاں نے اپنے قلم سے تصدیق کی ہے۔ یہ شعر فردوس مکانی یعنی بابر بادشاہ کا ہے:

مجکا نہوا کچھ ہوس مالک وموتی

فقرا ہیضہ بس بولغو سیدور پانی وروتی

پہلا مصرع تو بالکل صاف اور واضح ہے کہ" مجھ کو ہوس مالک و موتی نہ ہوئی " اور دوسرے مصرعے میں "پانی" اور "روتی" اُردو کے الفاظ آئے ہیں۔ دوسرے مصرعے کا مطلب ہے کہ فقیروں کے لیے روٹی، پانی ہی کافی ہے۔

حکیم یوسفی جن کا عہد سکندر لودھی کے عہد سے لے کر ہمایوں کے دور تک رہا۔ یوسفی صاحب نے ایک لغت بنام "قصیدہ در لغات ہندی" لکھا۔ جس میں بڑی عقل و فہم کے ساتھ حکیم یوسفی نے علمِ طب سے متعلق مختلف اشیاء اور دواؤں کے فارسی ناموں کے اُردو مترادفات درج کیے۔ یہ منظوم رسالہ "خالق باری"

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

خاص کر طلبہ کے فائدے کے لیے لکھا۔ اس میں اُردو مترادفات دیے گئے تاکہ اشیاء اور ادویات کی تصاویر کے ذریعے طلبہ کو نام ذہن نشین کرائے جاسکیں۔

"آنکھ چشم وناک بینی، آوں ابرو، ہوتہ لب

دند دنداں، کارہ کردن، گوتہ زانو، مونڈ سر

کھالی پوست وپیر مغزواستخواں گوپندھاڈ

انگلی، انگشت باشد، انگوتہ انگشت نر"5

اُردو تلفظ پر پنجابی زبان کے اثرات اس بات کی تصدیق کر رہے ہیں کہ اردو زبان کی ابتداء سے ہی پنجابی زبان نے اپنی خاص خدمات پیش کیں ہیں۔ اسی طرح سیلم شاہ سوری کے عہد حکومت میں جب ہمایوں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ اُجے چند بھٹناگر، بسر دنی چند ساکن نے شہر سکندر آباد 940ھ / 115ع میں "خالق باری" کی طرز پر ایک منظوم رسالہ تصنیف کیا۔ اس رسالے میں بھی فارسی الفاظ کے اُردو مترادفات درج کیے گئے۔ اس منظوم رسالے کا نام درج نہ ہونے کی صورت میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اس بے نام رسالے کا نام "مثلِ خالق باری" رکھا۔

اس کے بعد شمالی ہند میں اس دور کی سب سے اہم تصنیف افضل کی "بکٹ کہانی" کا منظرِ عام پر آئی۔ افضل فارسی اور اُردو زبان کے شاعر تھے۔ اس "بکٹ کہانی" میں کل 325 اشعار موجود ہیں۔ یہ "بکٹ کہانی"، "بارہ ماسہ" کے طرز پر لکھی گئی۔ جس میں مکمل فارسی اشعار کی تعداد 41 ہے۔ اور ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن میں ایک مصرع فارسی زبان اور دوسرا اُردو زبان کے ملاپ سے مکمل کیا گیا۔ "بکٹ کہانی" ایک طویل نظم ہے جو اپنے اندر تسلسل قائم کیے ہوئے ہے۔ عال بول چال کی زبان میں یہ عشقیہ منظوم ہجر و فراق پر مبنی ہے۔ مزید براں شاہ جہاں کے عہد حکومت میں فارسی زبان غزل، لب ولہجہ اور احساس میں اُردو الفاظ دھر آئے ہیں اور یوں اُردو زبان کو مزید تقویت ملی۔

پہلی فصل کے آخری اور تیسرے باب کو دورِ اورنگ زیب (۱۶۵۷ع–۱۷۰۷ع) کہا گیا۔ اس تیسرے باب میں جمیل جالبی نے اورنگ زیب عالمگیر (۱۹۵۸ – 1707) دور حکومت کو تمہیدی پیرائیہ میں بیان کیا ہے۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ شوق و ذوق کو مد نظر رکھتے ہوئے مفصل انداز میں بیان کیا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں فارسی زبان کی بنیادیں کمزور پڑنے لگی۔ اس کے برعکس زبان اُردو نے اپنی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے اپنی جڑیں مضبوطی کے ساتھ برصغیر میں پھیلانی شروع کر دی۔ جس کے نتیجے میں مدارس اور مکتبوں میں اُردو زبان ذریعہ تعلیم بنی۔ اس کے برعکس دکن میں اردو زبان کو اتنا فروغ ملا کہ وہاں کے اہل ذوق اسی زبان سے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرنے لگے۔ دکن کے اثرات شمال کے اہل علم و ادب تک جا پہنچے۔ چنانچہ یہ زبان اُردو یہاں کی اصنافِ نثر اور اصنافِ سخن کو متاثر کرنے لگی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں بر شمار کتب اردو زبان میں ترجمہ ہونے لگی۔ اور فارسی زبان کی نظامِ تعلیم میں اتنی ہی جگہ رہ گی جتنی کہ آج ہمارے تعلیمی نصابوں میں انگریزی زبان کی ہے۔

عہد عالمگیر میں عبدالواسع بالنسوی کا نام علمی و ادبی سطح پر نہایت اہمیت کے حامل ہے۔ میر عبدالواسع بالنسوی اُردو زبان کی تاریخ میں "غرائب اللغات" کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ بحیثیت معلم آپ نے "رسالہ عبدالواسع"، "شرح بوستان"، "اشرح زلیخا"، "صمد باری" تصانیف کیں۔ "غرائب اللغات" اُردو لغت نویسی کی پہلی کڑی ہے۔ جس میں اردو کے ایسے الفاظ درج ہیں جو اس وقت کی فارسی لغات میں نہیں ملتے تھے۔ لغت کی ضرورت تو عموماً

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

کبھی بھی پیش آسکتی ہے۔ لیکن اس کی خاص ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب کوئی زبان اپنے ارتقائی مراحل میں ہو۔ تاہم، یہ لغت "غرائب اللغات" اردو زبان و ادب سے رغبت رکھنے والوں کے لیے کسی انمول تحفے سے کم نہیں۔

مولانا شیخ عبد اللہ انصاری کا تذکرہ جمیل جالبی نے تین سے چار صفحات پر بیان کیا ہے۔ ان کی غزل نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے اشعار پر اختصار کے ساتھ اپنا مؤقف پیش کیا ہے۔ جمیل جالبی کے بقول مولانا شیخ عبد اللہ انصاری کی غزل کے اشعار میں دو اثرات نظر آتے ہیں۔ ایک فارسی زبان کا اثر جو فارسی تراکیب، بندشوں، رمزیات، علامات اور مضامین میں ملتا ہے۔ جبکہ دوسرا دکنی روایات اور زبان و بیان پر مبنی اثرات ملتے ہیں۔

فصل دوم:

فصل دوم جس کو چار ابواب میں منقسم کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے واضح کیا ہے۔ کہ جب خطہ بر عظم میں باہر سے آنے والی قومیں آباد ہوئیں۔ تو اس کے پیشِ نظر برصغیر میں سیاسی، تہذیبی، معاشرتی و لسانی سطح پر تبدیلیاں رونما ہونے لگی۔ باہر سے آئی قوموں کے خیالات و عادات مقامی باشندے قبول کرنے لگے۔ تاہم، ان کی بولیاں مقامی بولیوں سے مل کر نئے مرکبات بنانے لگی۔ تہذیبی سطح پر اِس لسانی عمل نے برصغیر پر گہرے اور دوَرس اثرات چھوڑے۔ عرب کے مقامی بالغرض تجارت ہندوستان کی سرزمین پر وقتاً فوقتاً قدم رکھتے رہے۔ جس کی وجہ سے گجرات، مالابار، سندھ اور ملتان سے قدیم رہا۔ اس تجارتی معاملات کی بدولت عربی زبان کے اثرات مقامی بولیوں پر پڑے۔ اور کچھ ہی عرصے بعد زبان فارسی بھی اس زبان میں شیر و شکر ہونے لگی۔ اس میل ملاپ سے ایک ایسا خمیر تیار ہوا جس سے اظہارِ خیالات میں سہولت پیدا کی۔ جس کی وجہ سے قدیم اُردو کے نمونے وقت کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں میں نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کی فتوحات شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک پھیلی تو فاتحین اپنے ساتھ زبان کا اثر جو سندھ، ملتان، پنجاب اور سرحد سے ہوتا ہوا دہلی میں لائے۔ وہ اثرات ان زبانوں میں داخل ہوئے۔ اس طرح زبان کا ایک روپ گجرات میں ملتا ہے۔ جسے "گجری" یا "بولی گجرات" کا نام دیا گیا ہے۔ گجرات کا علاقہ قدیم تاریخی حیثیت میں بین الاقوامی شہروں میں شامل ہوتا تھا۔ لہٰذا یہ علاقہ آغاز سے ہی بھروچ اور سورت کی بندگاہوں کا مرکز اور تاجر حضرات کی خرید و فروغ کے لیے بھی خاص اہمیت رکھتا تھا۔ علماء اہلِ علم اور صوفیاء اکرام کو خاص اہمیت کے ساتھ ساتھ معاشی و معاشرتی سہولیات سے نوازا جاتا تھا۔ جس کے پیشِ نظر اہلِ علم و دانش کا اس خطہ گجرات کی جانب جوق در جوق ہجرت ہوتی رہی۔ صوفیاء کرام نے گجرات کے ساز گار ماحول کو دیکھتے ہوئے یہاں اشاعتِ اسلام کو فروغ دیا۔ جس کے سبب مسلمانوں نے اس زبان اُردو کو من و عن قبول کیا۔ اس عمل کے تحت معلوم ہوتا ہے کہ زبان اُردو ادبی سطح پر خطہ گجرات میں اپنی جگہ بناتی نظر آرہی ہے۔ بات واضح رہے کہ شمال سے آئی ہوئی زبانیں عربی اور فارسی جب گجرات میں آکر ملی تو اس میل میلاپ کے امتزاج سے زبان کی ایک نئی شکل ظہور پذیر ہوئی جو وقتِ رفتاء کے ساتھ ساتھ "گجری اُردو" کہلائی۔

باب دوم نویں اور دسویں صدی ہجری کے ملفوظات، لغات اور کتبے (1400ع-1600ع) پر مختص کیا گیا ہے۔ اس باب میں گجرات آئے صوفیاء و علماء کرام کے فقرات اور ملفوظات ملتے ہیں۔ جس سے اُردو زبان کے اثرات خطہ گجرات میں واضح ہوتے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ سید برہان الدین کے فقرات جو انہوں نے مختلف موقع پر ادا کیے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "کیا ہے، لوہ ہے کہ لکڑ ہے کہ پتھر ہے۔"[6] اس دور کے حالات کو دیکھتے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں قوالی کا عام رواج تھا۔ لہٰذا اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ قوالی عام ہندوی زبان میں ہوتا کہ عام عوام بھی اس کیف و سرور کی محفل سے مستفید ہو سکیں ۔ مزید جمیل جالبی زبان کی وضاحت کے لیے حضرت قطب عالم کے فرزند شاہ عالم عرف شاہ منجھن کی زبان پر روشنی ڈالت ہوئے ان کا نمونہ کلام درج کیا ہے۔

"جو راجن جی اور نہایا ہوے تو مجھ جیسے فقیروں کی برسوں تیں کناسی کرے"7

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے والدین مخدوم، حضرت سید الاقطاب، شاہ وجیہ الدین علوی، شیخ محمد غوث گوالیری وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے گجری ادب کی تاریخ بیان کی ہے۔ اور نویں اور دسویں صدی ہجری کی ادبی روایت (1400ع-1600ع) ملفوظات کے جائزے سے مختلف باتیں مورخین کے سامنے آتی ہیں۔ جیسا کہ اس دور میں زبان اُردو کمزور سیّال حالت میں تھی۔ اس زبان میں گردونواح کے علاقوں کے اثرات قوتِ اظہار کو سہارا دیے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اس دور کے ادبی ملفوظات میں مختلف رنگ اسلوب اور لہجے نمایاں ہوتے نظر آرہے ہیں۔ اس زبان کے استعمال کرنے والے اپنی مادری زبان کا رنگ اس میں شامل کرتا چلا جاتا۔ اس صورتحال کے پیشِ نظر اس زبان کو ہندوی کا نام بھی دیا گیا۔ مورخین کی تحقیق کے مطابق اس دور کے ملفوظات میں پنجابی، گجراتی، برج بھاشا، سرائیکی اور کھڑی بولی کے اثرات موجود ہیں۔ اس بولی کو امراء سے لے کر صوفیاء حضرات اور عام عوام کو اپنی معاشی و معاشرتی ضروت کے تحت استعمال کیا۔ نویں صدی ہجری کے مفلوظات و فقرات کا موازنہ اگر دسویں صدی ہجری کی زبان سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس زبان اُردو کا روپ اُبھرتا اور صاف ہوتا چلا گیا۔

ادبی ملفوظات کے مطالعے کے ساتھ ساتھ نویں صدی ہجری کی لغت کا تذکرہ (1433ع) اہم ہے۔ گجرات کے رہنے والے فضل الدین بلخی کی تحریر شدّہ لغت "بحر الفضائل" بنیادی طور پر عربی، اور فارسی زبان میں تحریر شدّہ لغت ہے۔ اس لغت کے باب چہارم بعنوان "در الفاظ ہندوی کہ در نظم بکار آید" میں وہ ہندوی الفاظ ملتے ہیں۔ جو اس دور میں فارسی شعراء اپنی شاعری میں استعمال کیا کرتے تھے۔ اس لغت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس لغت میں ہندوی ناموں اور اصطلاحات کے ساتھ ساتھ مختلف علوم و فنون کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسے مرتّب کیا۔ فضل الدین بلخی نے اس لغت کی ایک فضل ایسی شامل کی جس میں صرف اور صرف ہندوستان کے پھولوں کے نام موجود ہیں۔ ان وضاحتوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نویں اور دسویں صدی ہجری میں اُردو زبان عربی اور فارسی کے ساتھ میل اپنی جگہ کافی حد تک بنا چکی تھی۔

باب سوم نویں اور دسویں صدی ہجری کی ادبی روایت (1400ع- ۱۶۰۰ع) پر مبنی باب ہے۔ اس باب میں جمیل جالبی اُردو شاعری کے حولے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بعض ناقدین کا یہ کہنا کہ اُردو شاعری نے محض اسلامی اثرات کے پیشِ نظر فارسی زبان و ادب کو اپناتے ہوئے ہندوی روایات کو مکمل نظر انداز کیا ہے۔ یہ بات سراسر قیاس آرائی پر مبنی اور غلط ہے۔ جمیل جالبی کے بقول چھٹی ہجری سے دسویں ہجری تک ہندوی ہی حاکم رہی۔ اس دور میں اُردو شاعری کی ابتدائی روایات خالص ہندوی اوصاف اور اوزان پر نہ صرف قائم ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے بلکہ برعظیم میں پھیلے ہندو تصوف کے انداز کو قبول کرتی نظر آتی ہے۔ جیسا کہ ناتھ پنتھیوں، بھگتی کال، نرگن واد، خواجہ مسعود سعد سلمان، امیر خسرو، بابا فرید، بو علی قلندر، پانی پتی، شرف الدین یحیٰ، کبیر داس، شیخ عبد القدوس گنگوہی، شاہ باجن، قاضی محمود دریائی، علی جیو گام دھنی، گرونانک، میرانجی شمس العشاق، برہان الدین جانم وغیرہ غرض یہ تمام لکھاری تمام شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک اسی ہندوی روایت سے جڑے ہوئے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے آج کے جدید دور میں اُردو زبان کے ساتھ انگریزی مستعمل ہوتے جارہی ہے۔ ایسے ہی اُس دور میں وقت کی بدلتی کروٹوں کے مطابق عربی اور فارسی زبان اپنی جگہ بنانے لگ گئی۔ وحدت الوجود اور دوسرے تصوف کے رنگ شمال سے ہوتے ہوئے دکن جا پہنچے۔ جہاں یہ روایت میرانجی شمس العشاق اور ان کے رفقاء میں برسوں تک قائم رہی۔ اسی طرح گجری اُردو شاعری علم العروض بھی ہندوی ہی ہیں۔ غرض آپ باجن کے کلام کا مطالعہ کریں یا پھر بابا گرونانک کا ان کے کالم میں موسیقی، ترنم اور ہندوی اثرات کی چھاپ نظر آئے گی۔ تاہم اس دور میں یہ کہنا کہ آیا صرف عربی و فارسی زبانیں ہی اثر انداز رہی ٹھیک نہیں۔ بلکہ ہندوی زبان و راویات کا اس زبان اُردو پر برابر اثر رہا۔ باب چہارم میں دسویں، گیارھویں اور بارہویں صدی ہجری کے اوائل میں گجری اردو روایت (۱۶۰۰ع – 1707ع) میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ وقت کی بدلتی رُتوں اور اکبر کی فتح کے بعد گجرات کے تہذیبی، سیاسی و معاشی حالات میں بھی تبدیلی رونما ہونے لگی۔ گجری ادب کے تخلیق کار اپنی علمی و ادبی ناقدری سے دل برداشتہ ہو کر اس کا متبادل راستہ تلاش کرنے لگے۔ ایسے میں دکن جہاں گجری ادب کی روایات ایک زمانہ ہوا پہنچ چکی تھی۔ اہل علم و ادب اور شاعری سے شغف رکھنے والوں کی نگاہ میں دکن گھر کرنے لگا۔ نتیجتاً دکن میں ادبی مراکز اُبھرنے لگے۔ گجرات سے آئے باذوق افراد کی فہرست خاصی طویل ہے۔ لیکن اس اُکھاڑ پچھاڑ میں گجری ادب کے ممتاز ترین چار نام باجن، جیو گام دھنی، محمود دریائی اور خوب محمد نظر نہیں

آتے۔ ہجرت کرنے والے اہلِ علم وادب میں شیخ احمد گجراتی کا نام جنہوں نے اپنی طویل مثنویاں "یوسف زلیخا" اور "لیلیٰ مجنوں" محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں پیش کی سامنے آتے ہیں۔ سید محمد مہدی اور ان کے رفقاء کی علمی و ادبی زبان اگرچہ فارسی تھی لیکن روزمرہ کی زبان جس میں وہ اظہار رائے پیش کرتے تھے وہ خالص گجری اُردو تھی۔ وضاحت کے لیے جیسا کہ ایک موقع پر کہا "اچھے جی اچھے "اور ایک موقع پر ملتا ہے شہ کی چوٹ شکر کی پوٹ"۔

دسویں ہجری میں ہجرت کرنے والوں میں میاں مصطفیٰ بھی شامل ہیں۔ ان کے فارسی مشہور مکتوبات جن کے بارے میں ملا عبد القادر بدایونی نے اپنی تصنیف "منتخب التواریخ" میں درج کیا "از مکتوبات او بوئے فقر و فن می آید"۔ مصطفیٰ نے فارسی زبان کے علاوہ ریختہ میں بھی اپنے خیالات و جذبات کو اظہار کیا۔

"وے چو کیں جو کہیں برا ھوا | ات ڈھل جو بہوں سیحس پڑے

ھور ولیوں سوں بھی آئے اڑے | ھم اس پنتھ چالیں کھڑے کھڑے

جو پیو جی ھمسوں نہیں جوا | وے چو کیں جو کہیں برا ھوا

کیا ھوا ھم جو بہر نگ ھوے | کوئی ترواراں کوئی بھوکھ موے

کوئی رھے سوپر جوئے جوئے "8

اس دور کے شعراء حضرات کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ہر دو فارسی اشعار کے بعد لازماً ایک شعر گجری اُردو میں موجود ہے۔ اس دور کے ملفوظات، دوہروں میں ہندوی اثرات بدرجہ اتم موجود ہے۔ بلکہ یہ زبان باجن اور محمود دریائی کے دور کے مقابلے نہ صرف آسان بلکہ عام جذبات و احساسات کو عام آدمی کی زبان میں ادا کیا جانے لگا۔ گیارہویں صدی ہجری میں یہ زبان مکمل ڈھل کر صاف ہو گئی۔

فصل سوم:

اِس فصل کو جمیل جالبی نے دو ابواب میں تقسیم کرتے ہوئے اُردو زبان وادب کی روایت بیان کی ہے۔ ان کے مطابق برعظیم پاک وہند کے نقشے میں غور کریں تو دو حصوں میں تقسیم دکھائی دیتا ہے۔ شمالی علاقہ جات دکن کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں اُردو زبان کو ادب کی قدیم روایت پروان چڑھی۔

علاء الدین خلجی کی فتح گجرات اور فتح دکن نے ان دونوں علاقوں کو ایک دوسرے سے قریب آنے میں مدد دی۔ گجرات اور دکن کو مختلف علاقوں کے حلقوں میں تقسیم کرکے ہر حلقے میں ترک سردار مقرر کیا۔ یہ سردار "امیر صدہ" کہلائے۔ ترک امیر اپنے لواحقین اور متوسطین کے ساتھ اس خطے میں آباد ہوئے۔ یہ امیر ان کے لواحقین و متوسطین ہی تھے۔ جو مختلف صوبوں کے رہنے والے اور اپنے گھروں میں اپنی اپنی مقامی بولیاں بولتے تھے۔ لیکن جب اس خطے کی عوام کے ساتھ باہم آپس میں ملتے تو اسی مشترک زبان میں بات کرتے جو وہ شمال سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ علاء الدین خلجی کی فتح دکن سے عرصہ دراز پہلے کے ہمیں اپنے بزرگان دین کے نام ملتے ہیں۔ جو دکن کے مختلف علاقوں میں خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ حاجی رمی (1225ع)، سید شاہ مومن (1200ع)، بابا سید مظہر عالم (1225ع)، شاہ جلال الدین گنج رواں (1446ع)، سید احمد کبیر حیات قلندر (1660ع)، شیخ ضیاء الدین (۱۳۳۸ع) اور بہت سے دوسرے صوفیائے کرام دکن کے مختلف علاقوں میں سجادہ بچھائے درسی اخلاق و تبلیغ دین میں مصروفِ عمل پیرا رہے۔ ان بزرگوں نے یہاں کی مقامی زبانوں کے الفاظ شمال کی زبان میں ملا کر ایک ایسا ہَیُولی تیار کیا۔ جس سے اظہارِ رائے کی مشکل حل ہو گئی۔ اُردو زبان کی ابتدائی ترقی میں ان بزرگان دین کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔ مولوی عبد الحق کا کہنا ہے کہ:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

"شمال سے جو زبان جنوب کی طرف گئی، اُس کی دو شاخیں ہو گئیں؛ سکن میں گئی تو دکنی لہجے اور الفاظ کے داخل ہونے سے دکنی کہلائی اور گجرات میں پہنچی تو وہاں کی مقامی خصوصیات کی وجہ سے گجری یا گجراتی کہی جانے لگی"۔9

اس دور میں بولے جانے والی زبان میں کوئی اصول وضوابط نہیں تھے۔ جیسا کہ املاء کے باقاعدہ اصول مقرر نہیں تھے اور نہ ہی یائے معروف اور یائے مجہول میں کوئی فرق تھا۔ دکنی اُردو میں گجری اُردو کی طرح بعض الفاظ سنسکرت کے ملتے ہیں۔ جیسے چتر، لوپ، سینسار وغیرہ۔

باب دوم میں ادب کی روایت نویں اور دسویں صدی ہجری کے اوائل میں (1430ع-1525ع) جو کہ نظامی سے اشرف تک کے دور تک ہے۔ جمیل جالبی کے بقول نویں صدی ہجری کے بہمنی دور کی تصانیف بہت کم بلکہ محدود حد تک ہم تک پہنچی ہیں۔ اس دور کی سب سے پہلی دریافت شدّہ تصنیف فخر دین نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" ہے۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ ناقص الاوسط ہے۔ بلکہ تقریباً آخر کے دو تین صفحات بھی کم ہیں۔ اس مثنوی کو زیر بحث رکھتے ہوئے جالبی صاحب نے آٹھ صفحات پر مشتمل مثنوی کو نہ صرف بیان کیا بلکہ باقاعدہ تفصیلاً ایک تسلسل کے ساتھ کہانی لکھتے چلے گئے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی واضح کی ہے کہ اس مثنوی کا اصل نام یہ نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ جبکہ مطالعہ کرنے والوں نے خود سے ہی اس مثنوی کے دو کرداروں کے نام پر "کدم راؤ پدم راؤ" کا نام دے دیا ہے۔ اس مثنوی میں سنسکرت اور پراکرت کے علاوہ علاقائی بولیوں کے الفاظ کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔

میراجی کی نظموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں "خوش نامہ"، "خوش نغز"، "سوال طالب"، اور "جواب مرشد" وغیرہ بیان کی گئی ہیں۔ چونکہ عام زبان میں لکھی جانے کی وجہ سے یہ نظمیں عوام کی تلقین اور مریدوں کی ہدایت کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ نظم "خوش نامہ"، "خوش نغز" ہندوی اوزانوں پر مبنی ہے۔ پس بہمنی دور میں اُردو زبان چاروں اطراف پھیل کر دکن کی سب سے بڑی اور واحد مشترک زبان بن کر اُبھرتی نظر آتی ہے۔ اس مشترک زبان کی بدولت اس عظیم سلطنت کے مختلف علاقوں میں ایک ساز گار ماحول ہوا۔ جس کی بدولت آئندہ دور میں ادبی تخلیق کے لیے راہ ہموار ہوتی چلی گئی۔

فصل چہارم:

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی اس فصل کو آٹھ ابواب پر مختص کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بہمنی سلطنت کا سورج گہنا چکا تھا اور بہمنی سلطنت کے مختلف صوبے آزاد ہونے لگے۔ سلاطین عثمانیہ کا شہزاد عادل شاہی سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ تھا۔ فارسی میں شعر کہا کرتا تھا۔ بانی سلطنت عادل شاہ سے لے کر ابراہیم عادل شاہ، علی عادل شاہ، ابراہیم عادل شاہ ثانی، سلطان محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی، سب ادب و شعر کی اس روایت کو سینے سے لگائے رہے اس دور میں اُردو اپنے ارتقا کی اس منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں اسے عام طور پر ادبی و تخلیقی سطح پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ دکنیت کے جوش و جذبہ میں جہاں شروع ہی سے شاہانِ دکن اس کی سرپرستی کر رہے تھے وہاں اب وہ واحد قومی زبان کے طور پر قبول کر لی گئی تھی۔ دفتری امور اسی زبان میں انجام دیے جا رہے تھے۔ اگر اس دور شعراء، علماء اور مورخین کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو ہندوستان میں مغلوں سے طویل دور حکومت کا مقابلہ کرتے "سہ نثر ظہوری" والے ملا ظہوری، "تاریخ فرشتہ" والے محمد قاسم فرشتہ، "تذکرۃ الملوک" والے رفیع الدین شیرازی کے ناموں کے ساتھ ساتھ برہان الدین جانم، شیخ داول، ملک قمی، حکم آتشی، عبدل، صنعتی، رستمی، میراں جی خدانما، ہاشمی، نصرتی وغیرہ اسی علم پرور سلطنت کے پھول ہیں۔

بہمنی دور حکومت میں شاہی دفتر ہندوی زبان میں کر دیئے گئے تھے یوسف عادل شاہ نے اپنے زمانے میں ہندوی (قدیم اردو) کو ہٹا کر شاہی دفاتر فارسی میں کر دیے لیکن ابراہیم عادل شاہ اوّل نے شاہی دفاتر کو پھر سے اُردو میں کر دیا۔ "تاریخ فرشتہ" سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ "... و دفتر فارسی بر طرف ساختہ ہندوی کرد۔"[10]

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

جگت گسرو کی کتاب "کتابِ نورس" اور علی عادل شاہ ثانی کی کلیات اس بات کی گواہ ہیں کہ ان لوگوں کا فارسی زبان سے خاندانی رشتہ تقریباً منقطع ہو گیا تھا اور اُردو زبان ہی اُن کی زبان ہو گئی تھی۔

بیجاپور کی مخصوص ادبی روایت و تصوف کے نمائندہ شاہ بریان الدین جانم (۱۵۸۳ع) ہیں۔ برہان الدین جانم، میر انجی شمس العشاق کے صاحب زادے اور خلیفہ تھے۔ اپنے وقت کے صوفیائے کرام میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ برہان الدین جانم کے ذہنی عمل، گجری روایت کی پیروی اصناف و اوزان اور بیان و زبان کی روایت سراغ ملتا ہے جو میر انجی سے ہوتی ہوئی ان تک پہنچتی ہے۔ میر الجی نے ہندوی میں لکھنے کا جواز یہ دیا تھا کہ لوگ چونکہ عربی اور فارسی نہیں سمجھتے اس لیے وہ اس زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں لیکن اس کے بر خلاف جانم اعتماد کے ساتھ اسی زبان میں شاعری کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہندوی میں شعر کہنا کوئی عیب کی بات نہیں۔ اس تمام میں اصل چیز تو معنی ہیں۔

اس سے اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ جانم کے زمانے تک اُردو زبان کی ادبی روایت پختہ ہو چکی تھی کہ اب اس میں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے کسی معذرت کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے ساتھ جمیل جالبی صاحب ایک تو بل بحث میں پڑھتے ہوئے ان کی نظم، غزل، تصوف پر بحث کرتے معلوم ہوتے ہیں ساتھ ہی ساتھ کہہ ڈالتے ہیں کہ جانم، میر انجی سے زیادہ اعتماد کے ساتھ اُردو زبان میں اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر عبدل کی مثنوی ابراہیم نامہ کو موضوع بحث بناتے ہوئے ان کا نمونہ کلام پیش کیا ہے۔

سلطان محمد عادل شاہ کا دور سلطنت بیجاپور اور گولکنڈا کے مذاقِ سخن کا سنگم بنا۔ ایک طرف بادشاہ کی علم پروری اور دوسری جانب ملکہ خدیجہ سلطان کی سخن سنجی نے مل کر سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ خدیجہ سلطان کی شادی کے موقع پر بے حساب جہیز کے علاوہ بہت سے غلام بھی آئے۔ انھی غلاموں میں ملک خشنود نامی ایک غلام تھا جس نے بیجاپور آکر اپنے حسن نظام، وفاداری اور شاعرانہ صلاحیت کے سہارے ترقی کی کہ عادل شاہ ۱۰۴۵ھ میں اسے سفیر بنا کر گولکنڈہ بھیجا۔ عادل شاہ کی فرمائش پر امیر خسرو کی "یوسف زلیخا" اور "ہشت بہشت" کو دکنی اردو میں منتقل کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی فصل چہارم کے پانچویں باب جس میں غزل کی روایت کا سراغ کو حسن شوقی (م-۱۶۳۳ع) کو مفصل بیان کرتے ہوئے اس باب کو حسن شوقی کے نام کیا ہے۔ اس دور میں فارسی اسلوب و آہنگ کے اثرات صرف عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے حدود ہی میں آہستہ آہستہ جذب ہو کر اُردو زبان کے راگ رنگ کو نہیں بدل رہے ہیں بلکہ پوری سرزمین دکن میں یہ تہذیبی عمل اور لسانی تبدیلیاں جاری رہیں۔ حسن شوقی کے کلام میں جو نظام شاہی سے وابستہ تھا یہ رنگ و آہنگ اردو شاعری کو ایک خاص شکل دیتا ہوا سامنے آتا ہے۔ اس میں جمیل جالبی نے حسن شوقی کے نمونہ کلام بھی درج کیے ہیں۔ جالبی صاحب نے اس فعل کے باب ششم مذہبی تصانیف پر فارسی اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے مذہبی رسالے، تصانیف اور صوفیائے کرام کے ملفوظات واقوال کا ذکر کیا ہے۔ جس میں واضح کیا گیا ہے کہ شیخ داول، شیخ محمود خوش اور امین الدین اعلیٰ کے ہاں موضوعات ایک جیسے ہیں۔ ان کا اسلوب فارسی سے متاثر ہو کر صاف ہوتا گیا یہ تینوں بزرگی فارسی کے زیر اثر بیجاپوری اسلوب کے نمائندہ بنے۔

شیخ علام محمد داول کی تصانیف "چہار شہادت" کا ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے خود کو شاہ جانم کا مرید ٹھہرایا ہے۔ شاہ داول کی نظمیں چہار شہادت، کشف الانوار، کشف الوجود اور ناری نامہ اور کئی خیال کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ دستیاب ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اسی فصل کے آٹھویں باب کو نیا عبوری دور قرار دیتے ہوئے نصرتی کا ذکر کیا ہے کہتے ہیں کہ نصرتی نے اپنے دور کی شاعری پر دو گہرے اثرات چھوڑے۔ پہلا اثر اس نے زبان و بیان کا ایک ایسا معیار قائم کیا جس تک دکنی شاعری نہیں پہنچی تھی۔ دوسرا یہ کہ ایک نئے فنی توازن کو قائم کیا۔ سید میراں میاخاں ہاشمی کا تذکرہ ہے۔ ہاشمی نے مثنوی یوسف زلیخا کی مدح لکھی۔ ساتھ ہی ان کی مخمس در نعت و مداح، حمد، معراج، آلِ رسول و آلِ علی کے بعد مہدی جونپوری کی طرح لکھی اور بتایا کہ یہاں تک ان کا اسلوب جدید اور صاف ہو چکا ہے۔

اورنگ زیب کی فتح بیجاپور کے ساتھ ہی گولکنڈا کا راستہ ہموار ہوا۔ شمال اور جنوب کے اس اتحاد سے جنوب کے ادبی روایت استعمال کے اسلوب کے اثر آتی چلی گئی اور نئے معیار زبان و سخن کے راستہ ہموار ہونے لگا۔ نئے مصدر اسلوب کی بنیادی صفت یہ تھی کہ قدیم اردو کا مقامی رنگ اس میں باقی نہ رہا اور سارے براعظم کا ادبی اظہار یکساں ہو گیا۔

فصل پنجم:

جمیل جالبی فصل پنجم کو سات ابواب پر بیان کرتے ہوئے اپنے قدم پھر سے پیچھے کی جانب یعنی قطب شاہی دور کی طرف لے گئے ہیں۔ اس مفصل فصل میں ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے نظر آتے ہیں کہ گولکنڈا کے بانی سلطان قلی قطب کا دور حکومت 924ھ / 1518ع سے شروع ہوتا ہے۔ اس چونسٹھ سال کے عرصے میں بہت سے فارسی شعرا کے نام سامنے آئے۔ تاریخ قطب شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا حسین طبسی جو سلطان تھی قطب شاہ کا قاضی اور ایرانی عالم تھا اس نے ایک کتاب تصنیف کی ان میں سب جانوروں اور پرندوں کا ذکر موجود تھا۔ جو ہندوستان و ایران میں پائے جاتے تھے۔ طبس نے جہاں فارسی و ترک میں ان جانوروں اور پرندوں کے نام دیے وہاں دہی میں مترادف الفاظ لکھے تھے۔ مکی (مکھی)، کبوتر (کبوتر)، کدہ (گدھا)، لونبری (لومڑی) وغیرہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ دکنی کی کتنی اہمیت بڑھی۔

دکن کی مشہور جنگ "جنگِ تالیکوٹ" کے چار سال ہونے کے بعد محمود، فیروز اور ملا کی آواز سارے دکن میں گونج رہی تھی۔ گولکنڈا کی سرکاری زبان فارسی تھی اور فارسی زبان کے شاعر و عالیم نہ صرف قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بلکہ اعلیٰ منصبوں پر بھی فائز تھے۔ اردو زبان بازاروں میں صوفیائے کرام کی خانقاہوں اور شعرائے کرام کے کلام میں نظر آرہی تھی۔ سرکاری امور تحریری طور پر فارسی زبان میں ایسے لکھے جانے لگے۔ جیسے آج کل انگریزی میں لکھے جاتے ہیں۔

محمد قلی ایک پر گو اور اردو زبان کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس سے پہلے بھی شعرا کا کلام ملتا ہے لیکن اب تک کسی نے اپنا دیوان فارسی طریقے سے یہ اعتبار حروف تہجی ترتیب نہیں دیا تھا۔ قلی قطب شاہ کا دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ جمیل جالی صاحب نے اپنی اس فصل میں تمام تر وہی باتیں مفصل انداز میں بیان کی ہیں جو اُنہوں نے اپنی سابقہ فصل میں تحریر کیں جسے مثنوی کرم راؤ پدم راؤ، یوسف و زلیخا، لیلی مجنوں، وغیرہ اور ساتھ میں نمونہ کلام بھی پیش کیا ہے۔

چوتھے باب میں ملا وجی کی سب رس، قطب مشتری کا تذکرہ مفصل پیرائے میں نیان کرتے ہوئے نمونہ کلام بھی درج کیا ہے۔ باب پنجم میں ملا وجہی کی سب اس کو مفصل بیان کرتے ہوئے اس کی کہانی بیان کی ہے۔ محمد قلی قطب کے بارے میں غوامی "طوطی نامہ" میں لکھتے ہیں۔ عبد اللہ نے محمد علی کی صورت میں جنم لیا لیکن شاعری مسلمع کی شاعری ٹھہری وہ اردو ادب کی روایت کو اپنی شاعری سے آگے نہ بڑھا پایا۔

فصل ششم:

ڈاکٹر جمیل جالبی کی یہ فصل دو ابواب پر مبنی ہے۔ اس فصل میں جالبی صاحب نے ولی دکنی کو ایک پورے باب میں مفصل انداز میں بیان کرتے ہوئے نمونہ کلام بھی پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ولی دکنی تک آتے آتے اردو شاعری کی روایت تین سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہو چکی تھی۔ اس روایت میں دور جحانات نے رنگ بھرا۔ پہلے ہندوی اصناف اور مزاج و اسطور نے اور دوسرا جب اس رنگ سخن میں آگے بڑھنے اور تخلیقی ذہنوں کو سیر اب کرنے کی صلاحیت باقی نہ رہی۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

ولی کی شاعری نے اُٹھ کر دلی کو فتح کیا اور زبان و بیان کے نئے معیار کا آغاز ہوا۔ ریختہ، ہندوی، گجری، دکنی (یہ اُردو زبان کے علاقائی معیاروں کے نام تھے اور دکنی اس کی آخری کڑی تھی) کی وہ ارتقائی شکل تھی۔ جس کے ساتھ اُردو زبان و بیان کا علاقائی رنگ و روپ ختم ہو گیا اور زبان نے ملک گیر سطح کا نیا معیار تلاش کر لیا۔ اُردوئے معلی اور اردو اس کے ارتقا کی مزید کڑیاں ہیں۔

ولی نے مزاج ریختہ کے مطابق فارسی اور عربی سے مناسب محور تلاش کیں اور انھیں اردو کے قالب میں ڈھال دیا ساتھ ساتھ انتخاب الفاظ سے اُردو شاعری کا مزاج مقرر کیا۔ نہ صرف فارسی تراکیب کو اپنایا بلکہ نئی تراکیب تراش کر اُردو زبان کو ایک نیا رنگ بھی دیا۔ جدید اصطلاح میں یوں کہنا چاہیے کہ فنکارانہ حیثیت سے ولی سے پہلے شعراء "رومانوی" تھے۔ ولی پہلا شخص ہے جس کے شاعرانہ مزاج کو "کلاسیکل" کہا جا سکتا ہے۔ آگے چل کر ڈاکٹر جمیل جالبی نے مفصل طور پر مختلف تذکروں میں ولی کے مختلف ناموں پر بحث کرتے ہوئے تمہیدی انداز اختیار کیا ہے۔

فراقؔ اور ولی پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ ولی اور فراقؔ کا ذکر اکثر تذکرہ نویسوں اور اہل تحقیق نے کیا ہے اور ساتھ ایک نمونہ کلام دیا ہے۔ جس میں ولی نے فراقؔ کے ایک مصرعے کی تضمین بھی کی تھی۔

ولی مصرع فراق کا بڑھوں تب جب کہ وہ ظالم

کمر سوں کھینچا خنجر، چڑھاتا آستیں آوے

ولی کی شاعری میں اتنے پہلو، اتنے موضوعات، اتنے تجرباتِ زندگی سمٹ آئے ہیں کہ جس پہلو سے اردو غزل کو دیکھیں اس کی واضح ابتداء ولی سے ہوتی ہے۔ ولی نے زبان و بیان کو ایک نیا معیار دیا۔ غزل کو کرسی صدارت پر بٹھا دیا۔ اس کے معاصرین اور بعد کی نسل نے اسکی پیروی کی۔ اس کے رنگ میں شاعری اور ایک نیا رنگ پیدا کیا۔ اس طرح مختلف ادواروں میں مختلف شعراء اُبھرے۔ جن پر ولی کی استادی کی مہر واضح طور پر ثبت ہے۔ حاتم کہتے ہیں۔

حاتم یہ فنِ شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں

لیکن ولی ولی ہے جہاں میں سخن کے بیچ

اس کے بعد متعدد شعراء حضرات کا ذکر کیا اور نمونہ کلام بھی جنہوں نے ولی کی مدح سرائی کی پیش کیے ہیں۔ شاعری کا زور محاورے، ضرب المثل جن سے شاعری میں شوخی پیدا ہوتی ہے کام لیا گیا۔ زبان صاف ہو کر سارے برصغیر میں ایک ہی سطح پر آ گئی۔

مجموعی جائزہ:

اُردو زبان کی ابتداء سے متعلق جمیل جالبی کے نظریات سیاسی ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کو چھے فعلوں پر اور ہر فصل کو مختلف ابواب پر قلم بند کیا ہے۔

جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ اردو زبان و ادب مسلمان فاتحین کی وجہ سے فارسی کے زیر اثر رہ کر پروان چڑھی لیکن فارسی کے ہم پلہ نہ آ سکی۔ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے اقتدار و حکمرانی کے زمانے میں پہلے سے موجود یہاں کی گری پڑی بازاری زبان آہستہ آہستہ سر اٹھانے لگی۔

فارسی، ترکی اور عربی لغات اس زبان میں مستقل طور پر شامل ہونے لگی۔ اسی دور میں اس زبان میں ادبی تخلیق کا بازار گرم ہوا اور اس زبان کے پروان چڑھنے کی وجہ یہاں کی معاشرتی، تہذیبی و سیاسی ضروریات تھیں۔ اسی ضرورت کے تحت ایک زبان کو دوسری زبان کے ساتھ ملا کر استعمال کیا گیا۔ اور اس طور پر یہ زبان ہندوستان کی زبان کہلائی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اُردو کے ارتقائی سفر کو مسلمانوں کی فتح سندھ و ملتان، پھر دلی اور گجرات سے لے کر دکن تک کو سیاسی ارتقا بیان کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود تاریخ کی یہ کتاب ادبی عقیدے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا مواد سماجی علوم کے دیگر شعبوں کے مخصوص درسی مواد کے عین مطابق ہے۔ اس بات کی داد دینی چاہیے۔ کہ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل اور ضخیم کتاب ہے جو کہ منظم نظریاتی اساس دیتی ہے۔

حوالہ جات

1. https://ur.wikipedia.org/wiki/%D8%AC%D9%85%DB%8C%D9%84_%D8%AC%D8%A7%D9%84%D8%A8%DB%8C

2. گیان چند جین، ڈاکٹر، اردو کی ادبی تاریخیں، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، 2000ء ص729

3. جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلد اوّل)، مجلس ترقی اُردو، لاہور

4. تاراچند، ڈاکٹر، تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات، مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور

5. حفظ اللسان معروف بہ خالق باری: مرتبہ حافظ محمود شیرانی، انجمن ترقی اردو دہلی، 1944ء، ص8

6. خاتمہ مراۃ احمدی: (جلد سوم)، ص47

7. ایضاً، ص48

8. مظہر محمود شیرانی، مرتبہ، مقالاتِ حافظ محمود شیرانی، جلد دوم، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور، ص177

9. عبدالحق، مولوی، اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی، 1988ء، ص65

10. محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، جلد دوم، ص49، مطبوعہ پونا، 1832ء